38

اگر تم قرآن کریم کو اس یقین سے پڑھو کہ اس میں ہر اعتراض کا جواب موجود ہے تو اس کے مطالب تم پر آپ ہی آپ کھلتے چلے جائیں گے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہنمائی حاصل ہو جائے گی

(فرمودہ 28 ستمبر 1956ء بمقام ربوہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''ہمارے ملک کے لوگوں میں عام طور پر یہ عَیب پایا جاتا ہے کہ وہ گزشتہ لوگوں کی اچھی باتوں کو بھی صرف اس لیے کہ اُن پر ایک زمانہ گزر چکا ہے نظرانداز کر دیتے ہیں اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ شاید ہمارے ملک کے لیے ہی کہا گیا ہے ورنہ یورپ والوں کو دیکھا جائے تو وہ اپنے سکولوں میں اٹھارویں صدی کے آخر تک سپین کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھاتے رہے ہیں اور اب تک وہ ان علوم کی تلاش میں لگے

ہوئے ہیں جو پرانے زمانوں میں مسلمانوں نے یا دوسری اقوام نے نکالے تھے۔ مثلاً فراعنہ کی قوم میں جو مَمیوں کے لیے ایجادیں کی گئی تھیں یورپ والوں نے اُن کی جستجو چھوڑی نہیں بلکہ ابھی تک وہ ان کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جو طریق ہم نے بڑی محنت اور دماغ سوزی کے بعد نکالا ہے وہ ناقص ہے۔ ہم بعض دوائیں نسوں میں بھر کر لاشوں کو محفوظ تو رکھ سکتے ہیں مگر ان دواؤں کا اثر صرف آٹھ دس دن تک رہتا ہے۔ اس کے بعد لاش محفوظ نہیں رہ سکتی۔ لیکن فراعنہ کے وقت میں جن لاشوں کو دوائیں لگا کر محفوظ کیا گیا تھا وہ ہزاروں سال تک بھی خراب نہیں ہوئیں۔ میں نے خود منفتاح کی لاش کو (جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون تھا) آج تک محفوظ دیکھا ہے۔ ہمارا تو یہی یقین ہے کہ منفتاح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ہی فرعون تھا کیونکہ اس سے قرآن کریم کی ایک پیشگوئی پوری ہوتی ہے۔ لیکن عیسائیوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اسلام کی ہر بات کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ منفتاح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا بیٹا تھا تا کہ قرآن کریم کی پیشگوئی جھوٹی ثابت ہو۔ لیکن ان کی قرآن کریم سے دشمنی تو ہمیشہ سے چلی آئی ہے اس لیے ان کا یہ رویہ کوئی قابلِ تعجب نہیں۔ بہرحال فراعنہ کے وقت میں لاشوں میں جو دوائیاں بھری جاتی تھیں اُن کی وجہ سے وہ لاشیں کئی کئی ہزار سال سے محفوظ چلی آتی ہیں اور آجکل کے لوگوں کی ایجاد کردہ دوائیں ابھی تک اُن کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔ یہی حال دوسرے علوم کا ہے۔

میں یورپ سے علاج کرا کے واپس آیا تو اگرچہ اُس وقت ستمبر کا مہینہ تھا مگر میرے جسم میں یہ علامت ظاہر ہوئی کہ رات کو کپڑا اوڑھنے کے باوجود مجھے شدید سردی لگتی جس سے میرا جسم تھر تھر کانپنے لگ جاتا۔ ڈاکٹروں نے اس کا بہت علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر یہ تجویز ہوئی کہ کسی طبیب کو بلایا جائے۔ چنانچہ ایک طبیب کو جو حکیم انصاری صاحب نابینا کے بیٹے ہیں دہلی سے بلانے کی کوشش کی گئی لیکن انہوں نے اِتنی فیس مانگی جو ہمیں معقول نظر نہ آئی اس لیے ہم نے انہیں بلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد یکدم اُن کا تار آیا کہ میں لاہور آ گیا ہوں مجھے بلا لیا جائے۔ چنانچہ ہم نے انہیں بلا لیا۔

جب وہ یہاں آئے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آ گئے؟ انہوں نے کہا میرے چھوٹے بھائی لاہور میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی اور میری بیوی دونوں بہنیں ہیں۔ ان کی تار پہنچی کہ ان کی بیوی کوٹھے پر سے گر گئی ہے اور اسے فالج ہو گیا ہے۔ اِس خبر کے پہنچتے ہی میری بیوی رونے لگ گئی۔ میں نے اسے تسلی دی لیکن اسے اطمینان نہ ہوا۔ آخر میں نے اسے کہا کہ میں خود لاہور جاتا ہوں اور مریضہ کا علاج کرتا ہوں۔ چنانچہ میں لاہور آ گیا۔ میں نے سمجھا کہ خدا تعالیٰ مجھے لاہور محض آپ کی خاطر لایا ہے۔ اس لیے میں نے لاہور پہنچتے ہی آپ کو تار کے ذریعہ اطلاع دے دی۔ بہرحال وہ طبیب یہاں آئے اور دو دن تک یہاں رہے۔ انہوں نے جو دوائی مجھے دی اُس کی ایک ہی خوراک کھانے سے وہ مرض دور ہو گیا اور میرا جسم گرم ہو گیا۔ اب دیکھ لو طب کو ہمارے ملک والے بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ بہت حقیر سمجھتا ہے لیکن یورپ میں بھی بڑے بڑے ڈاکٹر موجود تھے جن کا علاج کروایا گیا اور لاہور میں بھی بڑے بڑے ڈاکٹر موجود ہیں جن سے مشورہ لیا گیا۔ پھر بھی اُن کی بتائی ہوئی کسی دوائی سے فائدہ نہ ہوا۔ لیکن اِس طبیب کی بتائی ہوئی دوائی کی ایک ہی خوراک سے وہ مرض دور ہو گئی بلکہ اس نے ایسا اثر کیا کہ بجائے سردی لگنے کے مجھے پسینہ آنے لگ گیا۔ اب دیکھ لو یہ پرانی طب تھی جس نے مجھ پر اثر کیا۔ گالیاں دینے کو کوئی سَو دفعہ پرانی طب کو گالیاں دے لے لیکن مجھے اِس کا ذاتی تجربہ ہے کہ جہاں ڈاکٹروں کا علاج ناکام ہوا وہاں ایک طبیب کے بتائے ہوئے علاج سے فائدہ ہو گیا۔ اب اس تجربہ کو کیسے چھپایا جائے۔ جرمن ڈاکٹر جس سے مَیں نے علاج کرایا تھا اور جس پر مجھے بھی اعتماد ہے اُسے لکھا گیا تو اُس نے کہا کہ جو دوائی میں نے آپ کو بتائی تھی اُس کی ایک گولی زیادہ کھا لیا کریں۔ میں نے کہا کہ میں تو چھ چھ، سات سات گولیاں کھا جاتا ہوں۔ حالانکہ یورپ والے کہتے ہیں کہ دو تین گولیوں سے زیادہ نہیں کھانی چاہییں۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کہنے لگا بس! یہی علاج ہے کہ ایک گولی اَور کھا لیا کریں۔

جس طرح جسمانی باتوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے اِسی طرح دینی باتوں میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے اور پرانے علماء کی کتابوں میں ایسے معلومات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ

موجود ہے۔ مثلاً آج ہی میں تفسیری نوٹ لکھا رہا تھا کہ وہاں یہ ذکر آیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا تو وہ ایک چھوٹے سانپ کی طرح دوڑنے لگ گیا 1 مگر دوسری جگہ ذکر آتا ہے کہ وہ ایک عام سانپ کی طرح چلنے لگا 2 اور تیسری جگہ یہ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا تو وہ ایک اژدہا بن گیا۔ 3 ان تینوں مقامات پر سانپ کے لیے مختلف الفاظ کیوں استعمال کیے گئے ہیں؟ کیوں اسے ایک جگہ حَیَّۃٌ اور دوسری جگہ جَآنٌّ اور تیسری جگہ ثُعْبَانٌ کہا گیا ہے؟ میں اس کا جواب لکھوا رہا تھا کہ مجھے یاد آیا بچپن میں مَیں نے ایک مصری عالم کی کتاب پڑھی تھی اُس میں اسی اعتراض کا جو جواب دیا گیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ اور وہ جواب یہ تھا کہ جَآنٌّ چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں، حَیَّۃٌ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے سانپوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ثُعْبَانٌ بڑے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ ان تینوں الفاظ کے استعمال سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تضاد پایا جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو کوئی تضاد نہیں۔ جہاں قرآن کریم نے جَآنٌّ کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس سانپ کی تیزی کا ذکر ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا تو وہ چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے دوڑنے لگ پڑا۔ وہاں اس کی شکل کا ذکر نہیں کہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا۔ بلکہ یہ بتانا مدنظر ہے کہ چھوٹے سانپ کی طرح اُس میں تیزی پائی جاتی تھی۔ لیکن جہاں ثُعْبَانٌ کا لفظ آیا ہے وہ آیات پڑھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ واقعہ فرعون کے سامنے ہوا ہے اور فرعون کو چونکہ ڈرانا مقصود تھا اس لیے اسے ثُعْبَانٌ کی شکل میں سونٹا دکھائی دیا اور حَیَّۃٌ کا لفظ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے سانپوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس قرآنی آیات میں کوئی تضاد نہ رہا۔ اب دیکھ لو اس اعتراض کا جواب میں نے خود ایجاد نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کسی احمدی عالم یا حضرت خلیفۃ المسیح الاول سے سیکھا ہے بلکہ میں نے یہ جواب ایک مصری عالم کی کتاب میں پڑھا جو بچپن میں میری نظر سے گزری تھی۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے معاً بعد 1909ء یا 1910ء کی بات ہے جبکہ میری عمر کوئی اکیس برس کی تھی کہ اُس وقت میں نے ایک کتاب قِصَصُ القرآن منگوائی۔ اس کتاب میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ واقعات کے بیان میں احادیث میں بیشک بعض

باتیں زائد دکھائی دیتی ہیں مگر قرآن کریم پر پورا غور کیا جائے تو اس کی آیات میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ اس کتاب میں جہاں تک مجھے یاد ہے تیس یا چالیس واقعات کا ذکر ہے اور اس میں مصنف نے اپنی سمجھ کے مطابق تمام ایسے اختلافات کو دور کر دیا ہے جو بظاہر قرآن میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے جَآنٌّ، ثُعْبَانٌ اور حَیَّۃٌ کے الفاظ کے فرق کو بیان کر کے اُس تضاد کو دور کیا ہے جو قرآنی آیات میں دکھائی دیتا ہے اور اُس نے جو جواب دیا ہے وہ نہایت معقول ہے۔ آج جبکہ میں تفسیری نوٹ لکھوا رہا تھا مجھے وہ جواب یاد آ گیا اور میں نے سمجھا کہ تحدیث بِالنّعمت کے طور پر اس بات کا اقرار کروں کہ میں نے یہ نکتہ ایک مصری مصنف سے سیکھا ہے۔

اِسی طرح چھوٹی چھوٹی نحوی تراکیب کی وجہ سے معانی میں جو فرق پڑتا ہے اس کو میں نے ہسپانیہ کے ایک بڑے عالم ابوحیان کی تفسیر بحرمحیط سے اخذ کیا ہے۔ علامہ ابوحیان کو نحو کے استعمال میں بہت مہارت حاصل تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے نکتوں سے بڑے بڑے معانی پیدا کر لیتے تھے اور وہ اعتراضات جن کے جوابات علماء کو ساری عمر قرآن کریم پر غور کرنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے انہیں آسانی سے حل کر لیتے تھے۔

اِسی طرح تفسیر بالاحادیث کی بہت سی کتابیں موجود ہیں مثلاً علامہ سیوطی کی کتاب درمنثور ہی ہے لیکن ابنِ کثیر نے اِس بارہ میں نہایت قیمتی مواد جمع کیا ہے۔ وہ احادیث کو نقل کرتے ہیں تو زیادہ تر بخاری اور مسند احمد بن حنبل کی روایات لاتے ہیں اور ان کا ایسا موازنہ کرتے ہیں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ ہو جاتا ہے۔

بہرحال پرانی تفاسیر پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گزشتہ بزرگوں نے اپنے اپنے زمانہ میں بڑی محنت کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن سے بعض غلطیاں بھی ہوئی ہیں لیکن بہرحال اُن کی محنت قابلِ داد ہے۔ چونکہ قرآن کریم پر زیادہ تر اعتراضات اِس زمانہ میں ہوئے ہیں اس لیے اِس زمانہ میں درحقیقت قرآن کریم ہمیں دشمنانِ اسلام نے ہی سکھایا ہے۔ بچپن میں جب مجھے قرآن کریم اور احادیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی الماریوں میں مخالفینِ اسلام کی کئی کتابیں رکھی ہوئی ہوتی تھیں مثلاً پادری عبداللہ آتھم کی کتابیں تھیں، پادری وارث دین کی کتابیں تھیں۔

اِسی طرح اَور کئی کتابیں تھیں ان میں اسلام پر اعتراضات ہوتے تھے۔ میں نے پہلے اُن اعتراضات کو پڑھا اور بعد میں ان اعتراضات کو دور کرنے کی نیت سے میں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا۔ اگر میں مخالفینِ اسلام کی کتابیں نہ پڑھتا تو میرا اُن اعتراضات کی طرف ذہن نہیں جا سکتا تھا جو انہوں نے کیے ہیں۔

پس قرآن کریم کے پڑھنے میں جہاں ہمارے پرانے ائمہ نے ہماری مدد کی ہے وہاں ایک حد تک پادریوں نے بھی ہماری مدد کی ہے۔ یہ بات تو اُس زمانہ کی ہے جب میں صرف اُردو جانتا تھا۔ جب انگریزی زبان سیکھ لی تو مستشرقین کی کتب سے بڑی مدد ملی۔ مثلاً وہیری(Wherry) کی کتابیں ہیں، نولڈکے، میور، سیل 4 اور پامر 5 وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد جب میں نے قرآن کریم پر غور کیا تو میرا ذہن ان سب اعتراضات کے جوابات کے لیے تیار ہو گیا جو اِن دشمنانِ اسلام نے کیے تھے۔ اگر پہلے سے ان کے اعتراضات ذہن میں نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ میں بھی ان آیات پر سے یونہی گزر جاتا اور سمجھتا کہ ان پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ لیکن ان لوگوں نے پہلے سے کئی اعتراضات ذہن میں ڈال دیئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے قرآن کریم پڑھا میں نے اپنے اوپر فرض کر لیا کہ ان اعتراضات کو دور کرنا ہے۔ اور جب میں نے اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کا مطالعہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان تمام اعتراضات کا جواب سمجھا دیا۔

میں نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علوم میں اسی طرح ترقی بخشی ہے کہ میں نے کبھی کسی معترض کے اعتراض کو غیر اہم نہیں سمجھا بلکہ جو بھی اعتراض کسی معترض نے کیا میں نے اسے اہم سمجھا اور اُس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ بعض لوگ اِس قسم کے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اعتراض کرے تو ہنس پڑتے ہیں اور کہتے ہیں یہ بھی کوئی اعتراض ہے۔ ایسے لوگوں کو جواب نہیں سُوجھتا۔ لیکن جو لوگ عقل سے موازنہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کو دھوکا لگا ہے تو دوسرے کو بھی دھوکا لگ سکتا ہے اور پھر تیسرے کو بھی دھوکا لگ سکتا ہے بلکہ اگر ایک شخص کو صحیح اور جائز طور پر دھوکا لگ گیا ہے تو بیس ہزار کو بھی صحیح اور جائز طور پر دھوکا لگ سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں ان اعتراضات کو حل کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کامیابی کے

رستے کھول دیتا ہے اور ان پر تمام اعتراضات کی حقیقت واضح کر دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص محض بے ایمانی سے اعتراض کرتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص نے بے ایمانی سے اعتراض کیا ہے لیکن اگر ہمیں معلوم ہو کہ دھوکا لگنے کی کوئی وجہ موجود تھی اور معترض کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل تھی تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ اور اگر ہم ایمانداری سے غور کریں تو یقیناً ہماری توجہ اس طرف پھر جائے گی کہ اگر ایک شخص کو کسی دلیل کی وجہ سے ٹھوکر لگی ہے تو اَور اشخاص کے لیے بھی وہی دلیل ٹھوکر کا موجب ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس اعتراض کو دُور کریں تا کہ ان لوگوں کو ایمان نصیب ہو۔ بہر حال مجھے اللہ تعالیٰ نے اس ذریعہ سے بہت سے علوم عطا فرمائے ہیں۔ اسی طرح میری تفسیر میں اَور بھی بہت سے نکات ایسے آتے ہیں جن کا موجب عیسائی اور آریہ دشمن تھے۔ اگر ان کے اعتراضات نہ ہوتے تو میں غالباً وہ نکات بیان نہ کر سکتا اور میری توجہ ان کی طرف نہ پھرتی۔ میں نے دیکھا ہے کہ آریہ لوگ تو یونہی اعتراض کر دیتے ہیں جنہیں عقلی طور پر بڑی آسانی سے ردّ کیا جا سکتا ہے لیکن عیسائی مستشرق تاریخ کی بڑی گہری تحقیق کرنے کے بعد اعتراض کرتے ہیں اور لازمی طور پر اُن کا جواب دینے میں بھی بڑی تحقیق کرنی پڑتی ہے جس سے بہت کچھ علوم کُھل جاتے ہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ انسان قرآن کریم پر کامل ایمان رکھتا ہو۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر اعتراض پکا ہو گیا تو قرآن کریم کے متعلق شبہ پڑ جائے گا۔ لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ جتنا اعتراض پکا ہو اُتنا ہی قرآن کریم کی عظمت کا ظہور ہوتا ہے کیونکہ اگر پکے اعتراض کا جواب پہلے سے قرآن کریم میں موجود ہو تو یہ اس کی بڑائی اور عظمت کی دلیل ہو گی۔ محض بیکار باتوں کا جواب تو ہر کوئی دے سکتا ہے۔ کامل انسان کا ثبوت یہی ہوتا ہے کہ وہ کامل اعتراض کو توڑے۔ اگر یورپین مصنف اور مؤرخ بڑی سوچ بچار کے بعد کوئی اعتراض کریں اور اُس اعتراض کا جواب قرآن کریم کی اُنہی آیات میں مل جائے تو صاف پتا لگ جائے گا کہ یہ کلام کسی عالم الغیب ہستی نے اُتارا ہے جسے پتا تھا کہ اُنیسویں یا بیسویں صدی میں اس آیت پر عیسائی مصنفین فلاں فلاں اعتراض کریں گے۔ اس لیے اس نے تیرہ سَو سال پہلے ان اعتراضات کا جواب دے دیا۔ پس یہ ایمان کے بڑھانے والی

بات ہے کیونکہ اِس سے انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کی نازل کردہ نہیں بلکہ خداتعالیٰ کی نازل کردہ ہے۔ اگر یہ کتاب کسی انسان کی بنائی ہوئی ہوتی تو اس میں ہزاردوہزارسال بعد میں اُٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب نہ ہوتا۔ کیونکہ انسان کے ذہن میں وہی اعتراضات آ سکتے ہیں جو وہ خود نکالے یا اُس کے زمانہ کے لوگوں نے کیے ہوں۔ لیکن قرآن کریم میں تو اُن اعتراضات کا بھی جواب ہے جو ہزاردوہزارسال بعد میں آنے والے لوگوں نے کرنے تھے اور ہزاردوہزارسال بعد میں ہونے والے اعتراضات کا علم صرف خداتعالیٰ کو ہی ہوسکتا ہے ورنہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اعتراضات کا علم کیسے ہوسکتا تھا۔ پس اگر ان اعتراضات کا جواب جو بیسویں صدی میں ہونے تھے قرآن کریم میں موجود ہے تو صاف پتا لگ گیا کہ یہ کتاب خداتعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہے کسی انسان کی تصنیف نہیں۔

غرض قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ غیرمسلموں خصوصاً یورپین مصنفوں کی کتابوں کو پڑھا جائے کیونکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہندوؤں نے جو اعتراضات اسلام پر یا قرآن کریم پر کیے ہیں وہ زیادہ تر ضدّ اور تعصّب کی وجہ سے کیے ہیں اور ایسے اعتراضات کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ ان کے لیے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن عیسائی لوگ قرآن کریم پر غور کرنے اور بڑی چھان بین کرنے کے بعد اعتراض کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کے نزول اور ترتیب کے متعلق عیسائیوں نے وہ وہ باتیں لکھی ہیں جو بڑے بڑے مسلمان مفسرین نے بھی نہیں لکھیں۔ وہ لکھتے تو قرآن کریم کو ردّ کرنے کے لیے ہیں لیکن بعض اوقات خود ہی پھنس جاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ قصص جس میں ہجرت کی پیشگوئی پائی جاتی ہے اس کے متعلق عیسائی مصنفین بڑا زور مارنے اور تحقیق کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ حالانکہ اگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے تو ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سچے ہیں کیونکہ اگر یہ سورۃ مکی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پتا لگ گیا تھا کہ میں مکّے سے ہجرت کروں گا اور اس کے بعد میں ایک فاتح کی حیثیت سے دوبارہ اس شہر میں داخل

ہوں گا۔ اگر باوجود اس کے کہ آپ کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی علم نہیں تھا آپ یہ پیشگوئی فرماتے ہیں اور پھر وہ پوری بھی ہو جاتی ہے تو یہ آپ کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔ پس عیسائی مستشرق اس سورۃ کو مکی کہہ کر خود پھنس گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت کر گئے۔ اگر وہ یہ لکھ دیتے کہ یہ سورۃ مدنی ہے تو کہا جا سکتا تھا کہ مدینہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طاقت حاصل ہوگئی تھی۔ اس لیے اس قسم کی پیشگوئی کرنا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے اس سورۃ کو مکی قرار دیا اور اِسی طرح اپنی تحقیق سے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اظہار کر دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ اس سورۃ میں بعض آیات مدنی بھی ہیں لیکن عیسائی مصنفین اسے خالص مکی سورۃ قرار دیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے ہاتھ خود کاٹتے اور اسلام کی صداقت کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ پس غیر مسلموں کے اعتراضات کو پڑھ کر ایک سچے مومن کا ایمان بڑھتا ہے کیونکہ ان سے پتا لگتا ہے کہ دشمن نے قرآن کریم پر حملہ کی جو راہیں تلاش کی تھیں خداتعالیٰ نے ان کو پہلے سے بند کر رکھا ہے اور ہزار دو ہزار سال بعد جو اعتراضات وارد ہونے تھے ان کا جواب پہلے ہی قرآن کریم میں موجود ہے۔

بعض عیسائی مصنفین لکھتے ہیں کہ ہمیں سورتوں کے اسٹائل (STYLE) سے پتا لگ جاتا ہے کہ اس کی فلاں آیت مدنی ہے اور فلاں مکی۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ بات درست ہے کہ تمہیں قرآن کریم کے اسٹائل سے ہی پتا لگ جاتا ہے کہ اس کی فلاں آیت مکی ہے اور فلاں مدنی تو یہ قران کریم کا کتنا بڑا کمال ہے کہ خداتعالیٰ نے اس سورۃ کو جس میں ہجرت کی پیشگوئی تھی اس اسٹائل میں اُتارا جس کی وجہ سے تم نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی وجہ سے تمہیں اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ مکی زندگی میں ہجرت اور فتح مکہ کے متعلق جو پیشگوئی قرآن کریم نے کی تھی وہ سچی نکلی ورنہ اگر یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہوتی تو اسے اس بات کا کیسے علم ہو سکتا تھا کہ آج سے اتنے سالوں کے بعد وہیری، نولڈکے اور دیگر مستشرقین نے کسی سورۃ کے اسٹائل کی وجہ سے اسے مکی یا مدنی کہنا ہے اس لیے اس کا اسٹائل ایسا رکھو کہ اس سورۃ کے پڑھتے ہی ہر شخص معلوم کر لے کہ یہ مکی ہے۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں

کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے نازل کرنے والی ہستی کو تو ان اعتراضات کا علم تھا جو بیسویں صدی کے عیسائی مصنفین نے کرنے تھے لیکن ان عیسائیوں کو خود بیسویں صدی میں بھی یہ علم نہیں کہ ہم نے ان آیتوں کی کیا تفسیر کرنی ہے۔ وہ ایک آیت پر اعتراض کرتے ہیں لیکن اس آیت کی جب ہم تفسیر کرتے ہیں تو ان کا اعتراض ردّ ہو جاتا ہے اور اس طرح قرآن کریم کی فضیلت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ یہ کلام کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ عالم الغیب خدا کا اُتارا ہوا ہے اور اس کثرت سے اس میں علمِ غیب بھرا ہوا ہے کہ ہر آیت سے کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکل آتا ہے۔ گویا جیسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ اینٹ اینٹ کے نیچے فلاں چیز موجود ہے۔ اِسی طرح تم کوئی آیت اُٹھاؤ اس کے نیچے سے ایک معجزہ نکل آتا ہے اور اس طرح قرآن کریم سارے کا سارا معجزوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں کسی شخص نے آپ سے سوال کیا کہ قرآن کریم میں مومنوں کے متعلق اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ [6] آتا ہے حالانکہ یہاں عَلٰی هُدًی کی بجائے اُولٰٓئِکَ یُھْدَوْنَ اِلَی الْھُدٰی ہونا چاہیے تھا یعنی ان کو ہدایت کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ عَلٰی کا استعمال یہاں کس حکمت کے ماتحت کیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا عَلٰی هُدًی کے یہ معنے ہیں کہ مومن اس طرح ہدایت پر سوار ہوتا ہے جیسے کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو۔ گویا جس طرح گھوڑا سوار کے تابع ہوتا ہے اسی طرح ہدایت مومن کے قبضہ میں ہوتی ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ گویا معترض نے جس آیت پر اعتراض کیا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسی سے اُس کے اعتراض کو ردّ کر دیا اور قرآن کریم کی برتری اور اس کی فضیلت کو ثابت کر دیا۔

پس قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس کے پڑھنے سے پہلے اس بات پر ایمان لائے کہ یہ خداتعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کلام ہے۔ اس کے بعد وہ دشمن کے اعتراضات کو پڑھے اور یقین کرے کہ ہر اعتراض کا جواب قرآن کریم میں موجود ہے۔ وہ کسی اعتراض کو بِلاوجہ ردّ نہ کرے بلکہ انصاف سے اس پر غور کرے اور دیکھے کہ اعتراض

کرنے والے نے کس بناء پر اعتراض کیا ہے اور اس کی دلیل کیا دی ہے۔ پھر اس یقین کے ساتھ کہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں ہر معقول اعتراض کا جواب موجود ہے وہ قرآن کریم پر غور کرے اُسے یقیناً اس اعتراض کا جواب مل جائے گا اور ایسا جواب ملے گا کہ اس کا کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

مجھے یاد ہے جب تفسیر کبیر کی پہلی جلد جو سورۃ یونس سے کہف تک کی تفسیر پر مشتمل ہے لکھی جا رہی تھی تو سورۃ کہف کی آیت وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا7 کے متعلق مجھے گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ اس کا پہلی آیات کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ میں نے یہ تفسیر 1922ء کے درس کے نوٹوں سے تیار کی تھی اور زیادہ عرصہ گزرنے کی وجہ سے میں یہ بھول چکا تھا کہ اس آیت کا پہلی آیات کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ ایک دن میں عشا کے بعد تہجد کی نماز تک اس کے متعلق سوچتا رہا لیکن میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ آخر میں نے کہا اس وقت میں اسے چھوڑتا ہوں جب تفسیر لکھتے لکھتے یہ مقام آئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے خود ہی حل فرما دے گا۔ چنانچہ تفسیر لکھتے ہوئے جب میں اِس آیت پر پہنچا تو فوراً یہ آیت حل ہو گئی اور پتا لگ گیا کہ اس آیت کا پہلی آیات کے مضمون کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ چنانچہ میں نے اس آیت کی وہاں تفسیر لکھ دی۔

اِسی طرح چند دن ہوئے میں تفسیری نوٹ لکھوا رہا تھا کہ میری بیوی مجھ سے کہنے لگیں کہ میں ایک بات کہوں؟ میں نے کہا کہو۔ کہنے لگیں کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ آپ نوٹ لکھوا رہے ہوتے ہیں تو میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اس آیت پر تو فلاں اعتراض پڑتا ہے لیکن تیسری یا چوتھی آیت کے بعد آپ خود ہی اُس اعتراض کا جواب لکھوا دیتے ہیں۔ مجھے حیرت آتی ہے کہ میں نے تو وہ اعتراض آپ کو بتایا نہیں ہوتا پھر آپ کو اس کا پتا کیسے لگ گیا۔ میں نے کہا مجھے تو اس اعتراض کا پتا نہیں ہوتا لیکن خدا تعالیٰ کو تو اُس کا علم ہوتا ہے۔ اس لیے جب میں اُس مقام پر پہنچتا ہوں تو وہ اُس کا جواب میرے ذہن میں ڈال دیتا ہے تا کہ جس شخص کے دل میں بھی ایسا اعتراض پیدا ہو وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔

پس اگر کسی انسان کو قرآن کریم کی سچائی پر پورا یقین ہو تو اُسے کوئی اعتراض

ایسا نہیں ملے گا جس کا جواب قرآن مجید میں موجود نہ ہو۔ احادیث میں جو قرآن کریم کے متعلق آتا ہے یُصَدِّقُ بَعْضُهٗ بَعْضًا 8 اِس کا بھی یہی مطلب ہے کہ کوئی اعتراض قرآن کریم پر پیدا ہو خداتعالیٰ اُس کا جواب وہیں آگے پیچھے بیان کر دیتا ہے۔ پس قرآن کریم کو سمجھنے کا طریق یہی ہے کہ پہلے قرآن کریم کے دشمنوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھی جائیں۔ لیکن انہیں ایمان کے ساتھ پڑھنا چاہیے بے ایمانی کے ساتھ نہیں تا کہ تم اُن کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اور پھر انہیں اِس یقین کے ساتھ پڑھو کہ جو کچھ دشمنانِ اسلام نے لکھا ہے اُس کا جواب قرآن مجید میں موجود ہے۔ جب تم اِس طریق پر ان کتابوں کو اور پھر ان کے بعد قرآن کریم کو پڑھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اُن لوگوں نے قدم قدم پر جھوٹ بولا ہے اور قرآن کے اندر ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اِس طرح مومن کو اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے کسی اَور سواری کی ضرورت نہیں رہتی ہدایت ہی اُس کا گھوڑا بن جاتی ہے اور وہ اِس پر سوار ہو کر اپنے ربّ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور سیدھی بات ہے کہ جب ہدایت کسی کی سواری بن جائے تو اُسے کسی اَور سے راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً گھر کا مالک کسی کو خود ہی اپنے گھر لے جائے تو اُسے اُس گھر کا رستہ کسی اَور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر وہ کسی اَور سے رستہ دریافت کرے تو گھر کا مالک ہنس پڑے گا اور کہے گا کہ میں تو خود تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں تمہیں کسی اَور سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس عَلٰی ھُدًی کے یہی معنی ہیں کہ مومن ہدایت پر سوار ہو جاتا ہے اور ہدایت کو علم ہے کہ وہ خداتعالیٰ کی طرف سے آئی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف ہی اُس نے جانا ہے۔ جیسے ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ کوئی دھوبی تھا۔ اُس کی بیوی بڑی تیز مزاج تھی۔ وہ روزانہ اُس سے لڑائی کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ تنگ آ کر کہنے لگا کہ میں آئندہ اِس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا۔ اگر میں گھر واپس آیا تو مجھے ایسا ایسا سمجھنا۔ اس کے بیٹوں کا خیال تھا کہ اُن کی ماں کا قصور نہیں بلکہ خود اُن کا باپ جھگڑالو ہے۔ وہ پہلے بھی کئی دفعہ روٹھا تھا اور لڑکے ہمیشہ اُسے منا لاتے تھے۔ اِس دفعہ بھی وہ روٹھ کر چلا گیا۔ شام کو بیٹے گھر آئے تو انہوں نے اپنی والدہ سے پوچھا کہ باپ کہاں ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ تو روٹھ کر چلا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ماں تم چُپ کر کے بیٹھی رہو باپ کو منا کر لانے کی

ضرورت نہیں وہ آپ ہی بھوک سے بیتاب ہو کر گھر آئے گا۔ چنانچہ شام ہوئی تو دھوبی کو بھوک لگی۔ وہ سارا دن اِس انتظار میں رہا تھا کہ اُس کے بیٹے آئیں گے اور اُسے منا کر لے جائیں گے لیکن وہ نہ آئے۔اب پیٹ تو کسی کی بات مانتا نہیں۔ اُسے بھوک لگی تو اُس نے گھر واپس جانے کی ایک تجویز سوچی۔ دھوبی کے جانور کا قاعدہ ہے کہ وہ چونکہ روزانہ کپڑے لے کر گھاٹ پر جاتا ہے اور شام کو گھر واپس آتا ہے اس لیے اگر اُسے کُھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ سیدھا گھر میں آجاتا ہے اِدھر اُدھر نہیں جاتا۔ چنانچہ اُس نے اپنے بیل کو کھلا چھوڑ دیا اور اُس کی دُم پکڑ لی اور اس کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ گھر میں گُھسنے لگا تو اُسے شرم محسوس ہوئی کہ میں نے تو کہا تھا کہ میں اِس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا اور اب آپ ہی گھر آ گیا ہوں۔ اس لیے اُس نے بیل سے کہنا شروع کر دیا کہ جانے بھی دو، تم تو مجھے خود ہی گھسیٹ کر گھر لے آئے ہو ورنہ میں نے تو نہیں آنا تھا۔ اِس طرح وہ اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ جس طرح وہ بیل خود ہی گھر آ گیا تھا اسی طرح ہدایت بھی جانتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا گھر کونسا ہے اور وہ سیدھی اُس گھر میں پہنچ جاتی ہے۔

پس عَلٰی ھُدًی کے معنے یہی ہیں کہ ایک دفعہ مومن ہدایت پر سوار ہو جائے تو پھر وہ کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ اسے یہ خوف نہیں ہو گا کہ وہ کسی اَور کے گھر نہ چلا جائے بلکہ ہدایت خود بخود خدا تعالیٰ کے گھر میں پہنچ جائے گی کیونکہ اُسے علم ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے گھر سے آئی ہے اور اُس کے گھر اس نے جانا ہے۔

پس اگر تم قرآن کریم کو اس یقین سے پڑھو گے کہ اس میں ہر اعتراض کا جواب موجود ہے تو اس کے مطالب تم پر اس طرح کھلیں گے کہ تمہیں حیرت آئے گی کہ بغیر کسی سے پوچھے ہدایت تمہیں آپ ہی آپ خدا تعالیٰ کے گھر لے جا رہی ہے۔ وہ نہ اِدھر منہ موڑے گی اور نہ اُدھر منہ موڑے گی بلکہ سیدھی خدا تعالیٰ کے گھر لے جائے گی اور جب انسان خدا تعالیٰ کے گھر پہنچ جاتا ہے تو وہ ساری بدیوں اور ساری گمراہیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے''۔

(الفضل 14/اکتوبر 1956ء)

1: فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۱﴾ (طٰهٰ: 21)

2: اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ (القصص:32)

3: فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۸﴾ (الاعراف:108)

4: سیل:(George Sale)(1697ء تا 1736ء) مستشرق تھے اور انہوں نے 1734ء میں قرآن کریم کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا(وکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف زیرعنوان ''George Sale'')

5: پامر:(Edward Henry Palmer) (1840ء تا 1882ء) برطانیہ سے تعلق تھا۔ مستشرق تھے۔ کئی عرب ممالک کے سفر کئے۔ 1871ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ 1880ء میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔(وکی پیڈیا۔ آزاد دائرۃ المعارف زیرعنوان EDWARD HENRY PALMER)

6: البقرۃ: 6

7: الکھف: 24

8: کنز العمال جلد 1 صفحہ 619 مطبوعہ دمشق 2012ء حدیث نمبر 2861